اسلام اور مغرب میں تہذیبی تکثیریت وآ فاقیت کا تصور

(فکرِ اقبال کی روشنی میں)

ڈاکٹر انوار احمد* محمد آصف**

Abstract:

Iqbal is convinced of civilizational pluralism but in this civilizational pluralism different civilizations are not in conflict with each other. They rather unite on human grounds in such a way that they emerge together in the form of a true international or universal civilization. This concept of universal civilization is not an imperialistic one, rather, based on freedom, equality and human unity; it is a concept which unites civilizations despite their natural differences. Thus, emerges a universal civilization which not only fulfills the psychological and individual demands of all civilizations, but it also creates fraternity and unity between them through shared action, dialogue, utility and tolerance. In this way, Iqbal's concept encompasses both civilizational pluralism and civilizational universality. It, certainly, differs entirely from Huntington's concept of the clash of civilizations and Fukuyama's notion of universal civilization.

تہذیبی تکثیریت اور تہذیبی آفاقیت کے مسائل تہذیبوں کے اس دورِ کشاکش میں اہم ترین سوالات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس حوالے سے سپنگلر (Spengler) کا یہ جملہ بے حد معنی خیز ہے:

''تاریخ عالم ثقافتوں کی اجتماعی سوانح عمری ہے۔''(۱)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تاریخ عالم میں بیک وقت مختلف تہذیبیں موجود رہی ہیں۔ خود سپنگلر تاریخ میں آٹھ بڑی ثقافتوں کی نشاندہی کرتا ہے(۲) ٹائن بی (Toynbee) نے تیئیس تہذیبیں گنوائی ہیں(۳) خود ہنٹنگٹن نے موجودہ دور میں آٹھ بڑی تہذیبوں کی نشاندہی کی ہے۔ ۱۔صینی/چینی/کنفیوشی (Cinic)۔۲۔جاپانی (Japanese)۔۳۔ہندو (Hindu) ۴۔اسلامی (Islamic)۔۵۔مغربی (Western)۔ ۶۔آرتھو ڈوکس (Orthodox)۔۷۔لاطینی امریکی (Latin American)۔ ۸۔افریقی (ممکنہ)

* پروفیسر شعبہ اُردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان۔

** لیکچرار شعبہ اُردو، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور۔

(African(Possibaly)۔(۴)

گویا کثیر تہذیبی صورتحال ہر دور میں موجود رہی ہے اور دو یا دو سے زیادہ تہذیبیں ہر دور میں موجود رہی ہیں۔آج جبکہ مغربی تہذیب عروج پر ہے تو اس کے ساتھ ساتھ اسلامی، چینی، جاپانی تہذیبیں بھی مسلسل اپنا اثبات کر رہی ہیں۔ ماضی میں جبکہ اسلامی تہذیب عروج پر تھی تو اس کے ساتھ ساتھ مغربی، چینی اور جاپانی تہذیبیں بھی تھیں۔اسلام اور مغرب کے موجودہ تناؤ ہی کو مدنظر رکھیے تو اس سے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ تہذیبی تکثیریت یا کثیر تہذیبی دنیا نہ صرف تاریخ میں موجود رہی ہے بلکہ یہ قوموں کی نفسیاتی اور فطری ضرورت بھی ہے اس لیے کہ ہر قوم اپنی تہذیب کو عزیز رکھتی ہے اور اس سے محبت رکھتی ہے۔دنیا میں اگر مختلف اقوام موجود ہیں، مختلف مذاہب موجود ہیں تو مختلف تہذیبوں کا موجود ہونا ایک لازمی امر ہے اور جب دنیا میں تہذیبی تکثیریت ہوگی تو ان میں تصادم بھی ہوسکتا ہے اور اتصال بھی۔اور طے شدہ امر ہے کہ کوئی ذی شعور اور عقل سلیم کا حامل انسان یا کوئی قوم تصادم کی بات نہیں کرسکتی۔وہ ہمیشہ اخوت ومحبت اور اشتراک ویگانگت کی بات کرے گی۔تصادم اور غلط فہمیوں کو دور کر کے ایک پرامن برادری تخلیق کرنے کی کوشش کرے گی۔جس میں تمام قومیں اور ان کی تہذیبیں پوری محبت، رواداری اور آزادی کے ساتھ رہ سکیں۔بالفاظِ دیگر یہ ایسی عالمگیر اور آفاقی تہذیب کا تصور ہے جو تہذیبی تکثیریت کو برقرار رکھتے ہوئے تمام تہذیبوں کو ایک رشتۂ اخوت میں متحد ومنظّم کردے۔اور اس بات سے کون انکار کرسکتا ہے کہ آج اس کثیر تہذیبی دنیا میں، تہذیبی تصادم کے اس ماحول میں اسی قسم کے آفاقی یا کثیر تہذیبی تصور کی ضرورت ہے۔چنانچہ وحشت وبربریت کے اس تاریک دور کے حوالے سے ۱۹۵۰ء کی دہائی میں لیسٹر پیئرسن (Lester Pearson) نے خبردار کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

''انسان ایک ایسے زمانے میں داخل ہو رہا ہے جہاں مختلف تہذیبوں کو ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو پُرامن لین دین کے ساتھ ایک دوسرے سے سیکھتے ہوئے، ایک دوسرے کی تاریخ اور آدرشوں اور فن وثقافت کا مطالعہ کرتے ہوئے، ایک دوسرے کی زندگیوں کو زرخیز بناتے ہوئے رہنا سیکھنا ہوگا۔اس پُرہجوم چھوٹی سی دنیا میں دوسرا راستہ کشیدگی، تصادم اور آفات کا ہے۔''(۵)

تہذیبی آفاقیت کا یہ تصور تہذیبی تکثیریت اور تہذیبی ہم آہنگی سے وابستہ ہے۔یہ تو ظاہر ہے کہ محض کسی

ایک قوم کی تہذیب کو عالمی یا آ فاقی تہذیب کے طور پر رائج کرنا ناممکن ہے۔ عالمی تہذیب کا یہ تصور تو سامراجیت اوراس کے نتیجے میں تصادم کی راہوں کو ہموار کرتا ہے۔ چنانچہ اس تہذیبی تصور کو آ فاقی تصور نہیں کہا جا سکتا یہ تو کسی قوم کی استعماری خواہشات کا عکاس ہے اور تہذیبی ہم آہنگی کی بجائے تہذیبی افتراق وانتشار کا محرک ہے۔ آلِ احمد سرور نے درست لکھا ہے:

> ''یہ بات اب عام طور پر تسلیم کی جانے لگی ہے کہ ہر تہذیب مخصوص جغرافیائی، تاریخی، تہذیبی حالات میں وجود میں آتی ہے اور کوئی ایک ماڈل بجنسہٖ دوسری تہذیبوں اور سماجوں پر منطبق نہیں کیا جا سکتا۔ ہر تہذیب اور ہر سماج کو اپنا وجود برابر دریافت کرنا ہوتا ہے، اپنے باطن میں جھانکنا ہوتا ہے، اپنی انفرادیت اور اپنی شناخت کو پانا ہوتا ہے۔ اسی بنیاد پر وہ عالمی میلانات کے مطابق تعمیر کرسکتی ہے، اسی خصوصیت کے ذریعے وہ آ فاقیت کا جزو بن سکتی ہے۔''(۶)

آ فاقیت کا یہ تصور مغرب کے اس سامراجی آ فاقی تصور سے بہت مختلف ہے جو تمام تہذیبوں کو اپنے رنگ میں رنگنا چاہتا ہے اور جس کا نتیجہ آج اسلام اور مغرب کے تصادم کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔مغربی تہذیب آج ایک زبردست تہذیبی تکبر، خبطِ عظمت اور سامراجی آ فاقیت کے جنون میں مبتلا ہے اور اس کے سامنے ہنٹنگٹن کا فکری زاویہ رہنما اصول کے طور پر موجود ہے۔اس کے نزدیک آج اگرچہ مغرب کی بنیادوں میں زوال کے آثار موجود ہیں تاہم مغربی تہذیب آج بھی دنیا کی تمام تہذیبوں میں اپنی جمہوری اقدار، انفرادیت پسندی، سائنسی ترقی، سیکولرازم اور روشن خیالی کی وجہ سے سب سے منفرد اور طاقتور تہذیب ہے جسے چینی اور اسلامی تہذیبوں سے ان کی بنیاد پرستی، تنگ نظری، تشدد، جہالت، آمریت اور افرادی کثرت کی وجہ سے تصادم کا خطرہ ہے۔ چنانچہ ایک مہذب اور ترقی یافتہ تہذیب ہونے کی وجہ سے یہ مغرب کی ذمہ داری ہے کہ وہ نہ صرف ان تہذیبوں کو بلکہ تمام دنیا کو مہذب اور ترقی یافتہ بنائے۔(۷)

تہذیبی تکثیریت کا یہ نظریہ تہذیبی تصادم اور بالآخر مغربی آ فاقیت کے استعماری غلبے پر دلالت کرتا ہے۔اس طرح ہنٹنگٹن بھی گھوم پھر کر وہیں پہنچ جاتا ہے جہاں فوکویاما سرد جنگ کے خاتمے کے بعد پہنچا تھا کہ آج دنیا کے سامنے نجات کا ایک ہی راستہ ہے یعنی مغربی لبرل جمہوریت اور آزاد تجارت بالفاظِ دیگر مغربی تہذیب۔(۸)

بالعموم اس ''آفاقی تہذیب'' کی اصطلاح کا مطلب یہ ہے کہ تمام تر بنی نوع انسان تہذیبی طور پر ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ پوری دنیا میں اقوام ایک جیسی اقدار، ایک جیسی رسومات، ایک جیسے خیالات وعقائد، ایک جیسے اداروں گویا ایک ہی تہذیب کو قبول کرتے ہیں۔مشرق ومغرب میں، شمال وجنوب میں ایک ہی ثقافت رائج ہے۔ ایک جیسی اشیائے صرف، ذرائع ابلاغ ومواصلات اختیار کیے جارہے ہیں۔ ایک آفاقی زبان، ایک آفاقی مذہب کے رجحانات ابھر رہے ہیں یعنی آفاقی تہذیب کا تصور نہ صرف ایک عالمی نظام بلکہ ایک عالمی تہذیب کا تصور ہے لیکن تہذیبوں کی تاریخ بھی اورموجودہ دنیا کی صورتحال بھی اس بات کا جواب نفی میں دیتی ہے۔ مثلاً زبان کے مسئلے ہی کو لیجیے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ غالب تہذیب کی زبان بھی پوری دنیا میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ افہام وتفہیم کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ مختلف لسانی اور تہذیبی گروہوں کے افراد باہم رابطے کے لیے اسے استعمال کرتے ہیں گویا یہ زبان ابلاغ کا اہم وسیلہ بن جاتی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ دوسری تہذیبوں کی زبانیں اپنا وجود ہی کھو بیٹھتی ہیں۔ چنانچہ آج انگریزی کے ساتھ ساتھ اُردو، فارسی، عربی، فرانسیسی عام بولی جاتی ہیں بالخصوص اُردو، فارسی، عربی اورمینڈارین زبانیں تو باقاعدہ مسلم اور چینی تہذیب کو سامنے لاتی ہیں، یہی صورتحال مذہب کی ہے۔ بڑی بڑی تہذیبوں کی بنیاد ہی عظیم مذاہب پر ہے۔ مختلف مذاہب اوران سے وابستہ تہذیبیں ہمیشہ سے موجود رہی ہیں اور موجود ہیں۔ آج جتنی شدت سے عیسائیت اورمغربیت اُبھر کر سامنے آتی ہے اتنے ہی شدت سے اسلام اور اسلامیت اُبھر کر سامنے آتی ہے۔...... اسی طرح ہندومت بھی موجود ہے، بدھ مت بھی اوران سے وابستہ تہذیبیں بھی۔ جہاں تک بعض مشترک اقدار کا تعلق ہے مثلاً 'جذبۂ آزادی' تو یہ ہر تہذیب بلکہ فطرتِ انسانی کا خاصا ہے۔ اگر تاریخ میں کچھ اقدار انسانوں میں مشترک رہی ہیں یا ہیں تو اس سے انسان کے چند فطری یا محدود درویوں کی عکاسی تو ہوتی ہے پوری تہذیبی شناخت ممکن نہیں۔ اسی طرح مغربی جدیدیت کے تحت اُبھرنے والی اشیائے جدید، صنعتیں، ذرائع ابلاغ، مواصلات غرض پوری دنیا میں جدیدیت اختیار کی جارہی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی قوم یہ مغربی جدیدیت اختیار کرنے کی وجہ سے اپنی اقدار سے بھی محروم ہورہی ہے۔ اقدار کو قائم رکھتے ہوئے بھی جدید بنا جاسکتا ہے بالفاظِ دیگر اپنی تہذیب کے بنیادی مزاج کو قائم رکھتے ہوئے دوسری تہذیبوں کی مثبت اقدار کو قبول کیا جاسکتا ہے۔ جمال الدین افغانی، سرسیّد اور اقبال کا مشن یہی تو تھا کہ اپنی اقدار قائم رکھتے ہوئے اسلام کی تشکیلِ جدید کی جائے۔ جاپان اور چین جدید ہونے کے باوجود اپنی اقدار قائم رکھے ہوئے

ہیں۔آج اگر چہ مغربی تہذیب دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے لیکن کیا اس قوت، شان و شوکت اور پھیلاؤ کا مطلب یہ ہے کہ مغربی تہذیب عالمگیر تہذیب کے طور پر رائج ہوگئی ہے یا ہورہی ہے۔اس نظریے پر خود بعض مغربی مفکرین نے بھی تنقید کی ہے۔(۹)

مندرجہ بالا سطور میں زبان، مذہب، مشترک اقدار اور جدیدیت کے حوالے سے یہ بحث کی جاسکتی ہے کہ آج اگر چہ مغربی تہذیب اپنے پورے جوبن پر ہے تاہم دوسری تہذیبیں بھی (مثلاً اسلامی، چینی وغیرہ) اس کے ساتھ موجود ہیں اور اپنا احیاء و اثبات کرنے میں مصروف ہیں۔اس بحث میں سب سے اہم مغربی جدیدیت ہے۔عموماً دلیل یہ دی جاتی ہے کہ جیسے جیسے مختلف معاشرے تعلیم، دولت، سیاست، جمہوریت، اشیائے صرف اور طبقاتی ڈھانچے مغرب سے ملتے جلتے اختیار کرتے جائیں گے مغربی تہذیب آفاقی تہذیب بنتی جائے گی۔لیکن یہ لازمی امر نہیں ہے کہ جدیدیت کا لازمی نتیجہ مغربی تہذیب ہی ہو۔ابن انشاء کا وہ بلیغ فقرہ یاد کیجیے جو انہوں نے ''ابن بطوطہ کے تعاقب میں'' لکھا تھا کہ:

''جاپان تو جدید ہے لیکن جاپانی اتنے جدید نہیں۔ان کا طرزِ فکر وہی ہے کہ جو تھا، سلام و طعام، نشست و برخاست سب میں سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود ہیں۔''(۱۰)

چین میں یہ نعرہ لگایا گیا کہ ''بنیادی اصولوں کے لیے چینی علوم عملی استعمال کے لیے مغربی علوم''، جاپان میں یہ نعرہ لگایا گیا ''جاپانی روح اور مغربی ٹیکنیک''، مصر میں ۱۸۳۰ء میں محمد علی نے ''ضرورت سے زیادہ ثقافتی مغربیت کے بغیر تکنیکی جدت لانے کی کوشش کی۔''(۱۱) صرف یہی نہیں بلکہ اپنے افکار و خیالات کی جدید تشکیل بھی کی جاسکتی ہے۔بعض فرسودہ خیالات کو بدل کر نئے مغربی خیالات، وہ خیالات جو تہذیب کی بنیادی روح کو مجروح نہ کریں، لائے جاسکتے ہیں۔بالفاظِ دیگر اپنی تہذیب کے بنیادی مزاج، اصولوں اور خیالات کو قائم رکھتے ہوئے کسی جدید تہذیب سے یا مغربی تہذیب سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔چنانچہ اقبال نے تو خطبات پر مبنی اپنی کتاب کا نام ہی یہ رکھا ''تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ''۔مختصر یہ کہ جدیدیت کا مطلب لازمی طور پر مغربیت نہیں۔مکمل طور پر مغربی ثقافت اور مکمل طور پر مغربی اقدار، اداروں اور رواج کو اپنائے بغیر اور اپنی ثقافت کو ترک کیے بغیر بھی جدید بنا جاسکتا ہے۔اس کا مطلب ہے کہ جدیدیت اور مغربیت میں فرق ہے۔بقول آلِ احمد سرور:

''جدید کاری (Modernization) اور مغربیت (Westernization) میں

فرق ہے۔مغربیت کے معنی یہ ہیں کہ مغرب کے ذہن کی تقلید کریں اور ترقی کا جو راستہ مغرب نے اختیار کیا ہے اس پر آنکھیں بند کر کے چلتے رہیں۔مغربیت میں مغربی ماڈل کو بجنسہٖ اختیار کرنے کا معاملہ ہے۔ بیرونی اداروں کو اپنے گھر میں حکمران بنانے کا معاملہ ہے۔ گویا ایک ادارے کو جو ایک تحریک، تہذیب اور فضا رکھتی ہے اور خاص دھرتی اور آسمان سے آگاہ ہے ایک اجنبی فضا اور ماحول میں سامان کی طرح منتقل کرنے کا معاملہ ہے مگر جدید کاری میں مسئلہ تبادلے کا نہیں قلب ماہیئت کا ہے۔ٹرانسفر (Transfer) کا نہیں ٹرانسفرمیشن (Transformation) کا ہے دوسروں کے ادارے بجنسہٖ نہیں لیے جاسکتے۔ سماجی ادارے ماحول کے مطابق ہی ڈھالے جاسکتے ہیں''۔(۱۲)

ڈاکٹر جاوید اقبال نے بھی اسی حوالے سے بڑی متوازن بات کی ہے:

''جدیدیت معاشرتی زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضوں کی قبولیت کا عمل ہے جبکہ مغربیت یا مغرب زدگی ایک غیر ملکی کلچر کو اپنی زندگی پر حاوی کرنے کا نام ہے۔ اپنی روایات اور اقدار کے ساتھ وابستہ رہتے ہوئے تبدیلی یا جدیدیت کو قبول کیا جاسکتا ہے۔''(۱۳)

گویا مغربیت یہ ہے کہ مغربی تہذیب اور مغربی اقدار کو جوں کا توں قبول کرلیا جائے یعنی اندھی تقلید اور جدیدیت یہ ہے کہ اپنی بنیادی اقدار بھی قائم رہیں اور مغربی تہذیب کے زندہ اجزاء بھی جذب کر لیے جائیں۔ یہ نظریۂ عاریت (Borrowing Theory) ہے۔جس میں تہذیبیں دوسری تہذیبوں سے چیزیں مستعار لیتی ہیں اوران کو ڈھال کر، بدل کر، جذب کر کے اپنی تہذیب کی اساسی اقدار کو مستحکم کرتی ہیں اور ادوسری تہذیبوں کی بقا کی ضمانت دیتی ہیں۔(۱۴)

آفاقی تہذیب کا تصور مغربی تہذیب کا پیدا کردہ ہے۔ انیسویں صدی میں یورپ کے نوآبادیاتی سامراج کے تصور ''سفید آدمی کا بوجھ'' نے استعماری فتوحات اور سیاسی و معاشی غلبے کی توسیع کا جواز فراہم کیا۔ بیسویں صدی میں امریکی سرمایہ داری نے لبرل ازم، جمہوریت اور ٹیکنالوجی کے نام پر اس ''مشن'' کو آگے بڑھایا اور اب عہد جدید میں ایک عالمی نظام یا عالمی تہذیب کا تصور مغربی تہذیبی بالادستی کا جواز فراہم کر رہا

ہے۔تہذیبی آفاقیت دوسری تہذیبوں، دوسرے معاشروں اور دوسرے ملکوں پر اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے مغرب کا نظریہ ہے۔ انیسویں صدی میں جب کپلنگ (Kipling) نے ''White man's Burden'' کی اصطلاح استعمال کی تھی (۱۵) اس وقت بھی تیسری دنیا پر حکومت کے لیے مغربی سامراج کی راہوں کو ہموار کرنا مقصود تھا۔آج جب فوکویاما (Fukuyama) ''تاریخ کے خاتمے'' (۱۶) کی بات کرتا ہے تو اس کا مقصد بھی مغربی سامراج کی راہوں کو ہموار کرنا ہے۔ ہنٹنگٹن بھی لکھتا ہے:

> ''سامراجیت آفاقیت کا لازمی و منطقی نتیجہ ہے۔ یہ عمل صرف مغربی طاقت کی توسیع، اطلاق اور اثرات کے نتیجے میں ہوگا''، ''آفاقی تہذیب کا تصور مغربی تہذیب کا مخصوص کرشمہ ہے۔ انیسویں صدی میں ''سفید فام آدمی کا بوجھ'' کے تصور نے غیر مغربی معاشروں پر مغرب کے سیاسی اور معاشی غلبے کا جواز فراہم کیا۔ بیسویں صدی کے اختتام پر آفاقی تہذیب کا تصور دوسرے سماجوں پر مغربی ثقافتی بالادستی اور ان سماجوں کے مغربی رواجوں اور اداروں کی نقالی کرنے کی ضرورت کا جواز فراہم کر رہا ہے۔ آفاقیت غیر مغربی تہذیبوں سے محاذ آرائی کے لیے مغرب کا نظریہ ہے۔'' (۱۷)

مندرجہ بالا بحث سے ثابت ہوتا ہے کہ مغرب کا آفاقی تہذیب کا تصور حقیقت پر مبنی قرار نہیں دیا جاسکتا۔آفاقی تہذیب کا یہ جبری تصور مغرب کا سامراجی تصور ہے اور اسی ''تہذیبی مشن'' کا حصہ ہے جو مغرب نے نو آبادیاتی نظام کو مستحکم کرنے کے لیے وضع کیا۔ آفاقی تہذیب کا یہ تصور انسانی اور تہذیبی نفسیات کے خلاف ہے کیونکہ ہر تہذیب اپنا اثبات چاہتی ہے۔ عالم انسانیت جس میں بیک وقت کئی تہذیبیں موجود ہوں، اس کی تہذیبی، تاریخی، سیاسی، نفسیاتی، معاشی ضروریات آفاقی تہذیب کے اس تصور پر پوری نہیں اتر سکتیں جو مغرب کے فاشسٹ اقتدار کی حکمت عملی کا حصہ ہے۔ البتہ کثیر تہذیبی دنیا کو ایسی آفاقی اور عالمگیر تہذیب کی ضرورت ضرور ہے جو تہذیبی تکثیریت کو برقرار رکھتے ہوئے تمام تہذیبوں کو ایک رشتۂ اخوت میں پرو دے۔ مغربی تہذیب کے ''تہذیبی مشن'' اور ''ملوکانہ نفسیات'' کو مدنظر رکھا جائے تو یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ مغربی تہذیب، مغربی لبرل جمہوریت اور آزاد تجارت ہی دنیا کی نجات کا واحد راستہ ہے؟ اقبال کے نزدیک تو یہ ''سرمایہ داروں کی جنگِ زرگری'' ہے۔ لبرل جمہوریت ''نیلم پری'' کے روپ میں ایک ''دیو استبداد'' ہے جس کا ''چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر'' ہے۔ اخلاقی اقدار کے فقدان اور سامراجیت کی وجہ سے

مغربی سائنس کی ترقی اور لبرل جمہوریت اجتماعی فلاح و بہبود کی بجائے ''ملوکانہ اغراض'' ''حکمتِ فرعونی'' اور ''حکمتِ اربابِ کیں'' کا نمونہ بن کر رہ گئی ہے۔

حکمتِ اربابِ کیں مکر است وفن　　　　مکر وفن؟ تخریبِ جاں، تعمیرِ تن

(کلیاتِ اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص ۸۱۱)

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام　　　　چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

دیوا استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب　　　　تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی　　　　یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

(کلیاتِ اقبال اُردو، اقبال اکیڈمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۲۹۰، ۳۰۵، ۷۰۴)

چنانچہ نئے عالمی نظام کے ذریعے پسماندہ ممالک کو جمہوری، مہذب اور ترقی یافتہ بنانے کی جو تکرار موجودہ امریکی صدر کے بیانات میں، فوکویاما کے ''تاریخ کے خاتمے'' میں اور ہنٹنگٹن کے ''تہذیبی تصادم'' میں ملتی ہے اس کو سمجھنے کے لیے مغرب کے اس سامراجی اور نوآبادیاتی ''تہذیبی مشن'' کو مدنظر رکھنا ضروری ہے جس کے پس منظر میں کپلنگ کا نظریہ ''سفید آدمی کا بوجھ'' کارفرما ہے۔ اس ''ملوکانہ نفسیات'' اور ''تہذیبی مشن'' کے تحت یہ عزائم اور یہ بیانات سراسر فریب کی حیثیت رکھتے ہیں اور سامراجی استعمار کا وسیلہ ہیں۔

نسل ، قومیت ، کلیسا ، سلطنت ، تہذیب ، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

(کلیاتِ اقبال اُردو، ص ۲۶۲)

اقبال نہ صرف جدید تاریخ کے رجحانات سے واقف تھے بلکہ مستقبل کے اُفق پر اُبھرنے والی استعماری آہٹوں کو بھی محسوس کر رہے تھے۔ اقبال نے یکم جنوری ۱۹۳۸ء میں اپنی ریڈیائی تقریر میں سالِ نو کے موقع پر جو پیغام دیا تھا اگر اس کو آج کے حالات و واقعات اور عالمی تناظر میں رکھ کر دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اقبال موجودہ دنیا کا نقشہ پیش کر رہے ہیں:

> ''دورِ حاضر کو علومِ عقلیہ اور سائنس کی عدیم المثال ترقی پر بڑا فخر ہے اور یہ فخر یقیناً حق بجانب ہے...... لیکن تمام ترقی کے باوجود اس زمانے میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت، قومیت، اشتراکیت، فسطائیت اور نجانے کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ ان

نقابوں کی آڑ میں دنیا بھر میں حریت اور شرفِ انسانیت کی ایسی مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ جن نام نہاد مدبروں کو انسانوں کی قیادت اور حکومت سپرد کی گئی تھی وہ سفا کی اور خوں ریزی کے دیوتا ثابت ہوئے...... انہوں نے ملوکیت و استعمار کے جوش میں لاکھوں کروڑوں مظلوم بندگانِ خدا کو ہلاک و پامال کر ڈالا...... کمزور قوموں پر تسلط حاصل کرنے کے بعد ان کے مذہب، ان کی معاشرتی روایات، ان کے ادب اور ان کے اموال پر دستِ تطاول دراز کیا...... لاکھوں انسان بے دردی سے موت کے گھاٹ اُتارے جا رہے ہیں...... اور جو حکومتیں فی الحال آگ اور خون کے اس تماشے میں عملاً شریک نہیں ہیں وہ اقتصادی میدانوں میں خون کے آخری قطرے تک چوس رہی ہیں...... تمام دنیا کے اربابِ فکر دم بخود سوچ رہے ہیں کہ تہذیب و تمدن کے اس عروج اور انسانی ترقی کے کمال کا انجام یہی ہونا تھا؟......'' (۱۸)

اقبال کی اس تقریر میں ہمارے عہد کی روح بولتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور آج مغرب کی نام نہاد تہذیب یافتہ اقوام پسماندہ اقوام کے ساتھ جس وحشت و بربریت کا سلوک کر رہی ہیں وہ اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ عصر حاضر کی ''تہذیب یافتہ'' اقوام نے حال ہی میں فلسطین، کشمیر، بوسنیا، افغانستان، عراق اور لبنان میں جس بہیمیت کا مظاہرہ کیا ہے وہ اقوام عالم کے سامنے ہے۔ اقبال نے مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' میں بھی مغرب کے سامراجی جمہوری اور عالمی نظام پر کڑی تنقید کی ہے جو عہدِ حاضر کے عین مطابق ہے:

آدمیت زار نالید از فرنگ   زندگی ہنگامہ برچید از فرنگ
عقل و فکرش بے عیارِ خوب و زشت   چشم او بے نم، دل او سنگ و خشت
علم از و رسوا ست اندر شہر و دشت   جبرئیل از صحبتش ابلیس گشت
شرعِ یورپ بے نزاعِ قیل و قال   برّہ را کرد است بر گرگاں حلال

(کلیاتِ اقبال فارسی، ص۸۱۳ تا ۸۱۵)

آج مغرب امریکہ کی رہنمائی میں جس آفاقی تہذیب کی بات کرتا ہے اس کی بنیاد استحصال اور قتل و غارت پر ہے۔ اقبال کے مندرجہ بالا اشعار اور مندرجہ بالا تقریر کے اقتباس کو ذہن میں رکھ کر سارتر کے یہ

جملے پڑھے جائیں تو یہ گمان گزرنے لگتا ہے کہ مغربی استعمار اور آفاقیت کے حوالے سے سارتر اقبال کی فکر کو آگے بڑھا رہا ہے۔

''اے یورپ سے بھی بڑھ کر وحشی شمالی امریکہ، بول! آزادی، مساوات، انسانی برادری، محبت، وقار، حب الوطنی، تیرے پاس اور کیا ہے؟......نسل انسانی کے تصور میں آفاقیت کا ایک مجرد مفروضہ ہمارے ہاتھ لگا جو ہمارے حقیقی اعمال پر پردہ ڈالتا ہے...... غور سے دیکھیے تو آپ کو ایک قدر بھی ایسی نظر نہ آئے گی جو خون آلودہ نہ ہو۔''(۱۹)

عالمگیریت پر مبنی اس سامراجی نظریے کا سب سے زیادہ شدید حملہ جدید دنیائے اسلام پر ہوا ہے۔ مثلاً ڈینیل پائپس (Daniel Pipes) لکھتا ہے:

''معاشرتی و اخلاقی معیار کے فقدان سے بچنے کے لیے مسلمانوں کے پاس صرف ایک ہی راستہ ہے۔ جدیدیت کے لیے مغربیت کی ضرورت ہے......اسلام جدید بننے کے لیے کوئی متبادل طریقہ فراہم نہیں کرتا۔ سیکولرازم سے گریز ممکن نہیں۔ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے لیے اس فکری عمل کی ضرورت ہوتی ہے جو ان کے ساتھ چلتا ہے۔ یہی بات سیاسی اداروں کے معاملے میں بھی ہے۔ چونکہ صورت کے ساتھ مواد کی نقل بھی لازمی ہے اس لیے مغربی تہذیب سے سیکھنے کے لیے اس کی بالادستی کو تسلیم کرنا ضروری ہے۔ یورپی زبانوں اور مغربی تعلیمی اداروں کے بغیر گزارہ نہیں۔ خواہ مؤخرالذکر آزادئ خیال اور بے فکر زندگی کی حوصلہ افزائی کریں۔ مسلمان فقط اسی صورت میں تکنیکی ترقی کر سکتے ہیں اور آگے بڑھ سکتے ہیں جب وہ کھل کر مغربی ماڈل اپنا لیں۔''(۲۰)

یہ بحث کی جا چکی ہے کہ مغرب سے سیکھنے کے لیے مغربی تہذیب کی مکمل نقالی کی ضرورت نہیں اور اسلام جدیدیت سے متصادم نہیں ہے۔ مکمل نقالی کی بجائے اپنی بنیادی اقدار کو قائم رکھتے ہوئے مغرب سے استفادہ کیا جا سکتا ہے اس لیے مغرب کا آفاقی تہذیب کا تصور گمراہ کن اور استعماری خواہشات پر مبنی ہے۔ مغرب کی لبرل جمہوریت خون آلود ہے۔ آفاقی تہذیب کا تصور ''نظریاتی استعمار'' ہے جو بقول علی شریعتی استعمار کی سب سے بھیانک شکل ہے(۲۱) یا بقول فینن ''انسانیت کا غیر خونی قتلِ عام''(۲۲) یہی وجہ ہے کہ اقبال نے

مغرب کی اندھی تقلید پر نہایت سختی سے تنقید کی ہے۔

اقبال مغربی تہذیب کے آفاقی دعووں کے برعکس اسلام کے ایسے آفاقی دعووں کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔اس لیے کہ اقبال کے نزدیک اسلام اپنی ماہیت میں نہ تو کوئی قومی مذہب ہے نہ نسلی وموروثی بلکہ یہ خالصتاً ایسا دین ہے جس کی بنیاد انسانی ہے۔ایک تہذیب کی حیثیت سے اس کی کوئی جغرافیائی حیثیت، زبان، رنگ یا معاشرت نہیں۔اسلام میں سب انسان برابر ہے۔اسلام انسانی مساوات، اخوت اور حریت کی بنیادوں پر قائم ہے۔اسلام ہی وہ دین ہے جس کا ''مقصد باوجود تمام فطری امتیازات کے عالم بشریت کو متحد و منظّم کرنا ہے۔'' (۲۳)

> ''بنی نوع انسان کی اقوام کو باوجود شعوب وقبائل اور الوان والسنہ کے اختلافات کو تسلیم کرنے کے ان تمام آلودگیوں سے منزہ کیا جائے جو زمان، مکان، وطن، قوم، نسل، نسب، ملک وغیرہ کے ناموں سے موسوم کی جاتی ہیں اور اس طرح اس پیکر خاکی کو وہ ملکوتی تخیل عطا کیا جائے جو اپنے وقت کے ہر لحظہ میں ابدیت سے ہمکنار ہو۔'' (۲۴)

اس طرح اسلام تہذیبوں کی اکثریت کو قبول کرتا ہے اور اکثریت کے باوجود انہیں انسانی بنیادوں پر اس طرح متحد کر دیتا ہے کہ ایک صحیح انسانی عالمی نظام اور آفاقی تہذیب اُبھرتی آتی ہے۔اسلام آفاقی تہذیب کے جس تصور کو پیش کرتا ہے وہ سامراجی تصور نہیں ہے بلکہ اپنے بنیادی اصولوں، حریت و مساوات، اتحادِ انسانی کی بنیاد پر ایسا تصور ہے جو تمام تہذیبوں کی اکثریت اور انسان کی آزادی کو تسلیم کرنے کے باوجود، ان کے فطری امتیازات کو قائم رکھتے ہوئے، انہیں ایک لڑی میں پرو کر متحد کر دیتا ہے۔اس طرح ایک ایسی آفاقی تہذیب وجود میں آتی ہے جو تمام تہذیبوں کے نفسیاتی تقاضوں کو بھی پورا کرتی ہے اور ان کو متحد و منظّم بھی رکھتی ہے۔اس طرح اسلام کا تصور تہذیبی تکثیریت اور تہذیبی آفاقیت دونوں پر حاوی ہے۔وہ تہذیبی تکثیریت کو قائم رکھنے کے باوجود تمام تہذیبوں کو اخوت و اتحاد کے رشتے میں منسلک کر دیتا ہے۔تہذیبی تکثیریت کا یہ نظریہ ہنٹنگٹن کے اس تہذیبی تکثیریت سے قطعاً مختلف ہے جو تہذیبی تصادم کی طرف رخ کرتا ہے۔اس کے برعکس یہ نظریہ تہذیبی ہم آہنگی کو جنم دیتا ہے اور آفاقی تہذیب کے ایسے نظریے میں ڈھل جاتا ہے جو مغربی آفاقیت کے سامراجی تصور سے بے حد مختلف ہے، جو تمام تہذیبوں کو اپنے رنگ میں رنگنا چاہتا ہے۔پائپس کے محولہ بالا پیراگراف ہی کو مدنظر رکھا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ مغربی تہذیب کسی دوسری تہذیب کو (یا اسلامی تہذیب

کو) اپنا تشخص قائم رکھتے ہوئے آزادانہ طور پر زندگی گزارنے کی اجازت نہیں دیتی بلکہ مکمل طور پر مغربی ماڈل اپنانے پر زور دیتی ہے جو اس کی ملوکانہ اغراض کی دلیل ہے۔لیکن اسلام نہ صرف مغربی تہذیب کو بلکہ دوسری تمام تہذیبوں کے تشخص کو تسلیم کرتا ہے۔خدا کی ارضی بادشاہت ایک طرف تو تمام قوموں کی تہذیبی انفرادیت برقرار رکھتی ہے بلکہ حریت و مساوات کے تحت تمام قوموں میں اتحادِ انسانیت، باہمی رواداری، بین المذاہب ہم آہنگی، امن و محبت، انسانی حقوق کی بالادستی اور تہذیبی سنگم کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ یوں ہر تہذیب، ہر مذہب اپنے اپنے عقائد پر قائم رہتے ہوئے بھی اخلاقی اصولوں کی وجہ سے اسلام کی ارضی بادشاہت کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے۔دوسرے لفظوں میں اسلام ایک زندہ قوت ہے جو لوگوں کے عقائد و مذاہب اور فطری امتیازات کو تسلیم کرنے کے باوجود انہیں رشتۂ اخوت میں پرو دیتا ہے۔عیسائی عیسائی ہی رہتا ہے،مسلمان مسلمان ہی رہتا ہے۔کسی کو اپنا مذہب تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں۔اس لیے کہ حریت و مساوات اور اتحادِ انسانی اسلام کے وہ بنیادی اصول ہیں جو اقوامِ عالم کو متحد کر دیتے ہیں اور بین المذاہب ہم آہنگی اور بین الملّی اشتراک کو استوار کرتے ہیں۔اس طرح جو تہذیبی تشخص وجود میں آتا ہے اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے:

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی — گھر میرا نہ دِلّی نہ صفاہاں نہ سمرقند

(کلیاتِ اقبال،ص۳۵۷)

پھر اس اتحاد یا آفاقیت کا مقصد کسی قوم، کسی تہذیب کو تسخیر یا مطیع بنانا نہیں یعنی اسلام کو مغربی آفاقیت کے تصور کی طرح سامراجی اغراض سے کوئی غرض نہیں بلکہ وہ تو تمام انسانوں کو تمام تہذیبوں کو برابری کی بنیاد پر انسانی حقوق اور مؤاخات کے رشتے میں پروتا ہے......اس طرح اسلام ایک کثیر الجہتی عالمی نظام قائم کرتا ہے۔ یہ آفاقی یا عالمی نظام مغرب کے یک قطبی نظام کی طرح ظالمانہ نہیں بلکہ وسیع النظر ہے۔اس میں تمام اقوام کو برابر کے مواقع حاصل ہیں۔اسلام کی اساسی دعوت یہ ہے کہ دنیا کی تمام قومیں اور سارے انسان رنگ ونسل، ملک وملت کے امتیازات ختم کر کے بھائی بھائی بن کر ''جیو اور جینے دو'' کے اصول پر کاربند ہو جائیں۔ اسلام کا تصور مذہبی گروہ بندی کا نہیں بلکہ یہ تمام بنی نوع انسان کی آزادی اور برابری کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔یہ عالمگیر اور آفاقی دین ہے۔

''اس کی بنیاد انسانی مساوات، ذات پات اور رنگ ونسل کی نفی، بھائی چارے کا فروغ

، تمام قوموں کے درمیان عدل و انصاف کے قیام پر قائم ہے اور اس کا بنیادی مقصد ایک ایسے عالمگیر انسانی معاشرے کی تشکیل ہے جس میں تمام دنیا کی قومیں اتحاد و یکجہتی کے ساتھ رہتے ہوئے پرامن طور پر زندگی بسر کر سکیں۔ اور ہر قوم دوسری قوم کے مذہبی اور تہذیبی امور میں رواداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان میں کسی قسم کی دخل اندازی نہ کرے بلکہ ہر ایک پرامن طور پر اپنے مذہب کا پرچار کرے تاکہ جسے جو مذہب پسند آئے وہ اسے اختیار کر سکے۔'' (۲۵)

یوں اسلام کا آفاقی تہذیب کا تصور بھی تہذیبی تکثیریت پر مبنی ہے جو مغرب کی طرح تصادم یا سامراجیت و استعماریت کی طرف نہیں لے جاتا بلکہ انفرادی تفریق قائم رکھتے ہوئے بھی اقوام کے درمیان ہم آہنگی پیدا کر کے ایک عالمگیر معاشرے کی تشکیل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال اسلام کو ایک مذہب کی بجائے ایک قوت یا روحانی نظام کا لقب دیتے ہیں اور اس کی ازلی و ابدی بنیادوں پر وہ انسانیت کو متحد کرنا چاہتے ہیں (۲۶) اور اسی لیے اقبال نے نکلسن کے نام لکھا تھا:

''......مقصود اسلام کی وکالت نہیں بلکہ میری قوت طلب و جستجو صرف اس چیز پر مرکوز رہی ہے کہ ایک جدید معاشری نظام تلاش کیا جائے اور عقلاً یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کوشش میں ایک ایسے معاشری نظام سے قطع نظر کر لیا جائے جس کا مقصد وحید ذات پات، رتبہ و درجہ، رنگ و نسل کے تمام امتیازات مٹا دینا ہے۔ اسلام دنیوی معاملات میں نہایت ژرف نگاہ بھی ہے اور انسان میں بے نفسی و دنیوی لذائذ و نعم کے ایثار کا جذبہ بھی پیدا کرتا ہے اور حسن معاملت کا تقاضا یہی ہے کہ اپنے ہمسایوں کے بارے میں اسی قسم کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ یورپ اس گنج گراں مایہ سے محروم ہے اور یہ متاع اسے ہمارے ہی فیض صحبت سے حاصل ہو سکتی ہے۔'' (۲۷)

''اگر عالم بشریت کا مقصد اقوامِ انسانی کا امن، سلامتی اور ان کی موجودہ اجتماعی ہیئتوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام قرار دیا جائے تو سوائے نظامِ اسلام کے کوئی اور اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آ سکتا۔ کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے، اس کی رو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں ہے بلکہ عالم بشریت کی

اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے...... یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے، نہ نسلی، نہ انفرادی، نہ پرائیویٹ بلکہ خالصتاً انسانی ہے اور اس کا مقصد باوجود تمام فطری امتیازات کے عالم بشریت کو متحد و منظّم کرنا ہے۔'' (۲۸)

''اسلامی تعلیمات کی روح کسی خاص گروہ سے مختص نہیں ہے ۔ اسلام تو کائناتِ انسانیت کے اتحادِ عمومی کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے تمام جزوی اختلافات سے قطع نظر کر لیتا ہے...... دراصل خدا کی ارضی بادشاہت صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ انسان اس میں داخل ہو سکتے ہیں بشرطیکہ وہ نسل اور قومیت کے بتوں کی پرستش ترک کر دیں اور ایک دوسرے کی شخصیت کو تسلیم کر لیں۔'' (۲۹)

غرض اقبال کے افکار کا مطالعہ کیا جائے تو ایسے عالمی نظام اور آفاقی تہذیب کی نشاندہی کی جاسکتی ہے جو مغربی نظام کے برعکس تمام انسانیت کو امن وسلامتی، فلاح و بہبود اور ترقی وخوشحالی کی طرف لے جاسکتا ہے۔ یہ نظام، یہ سوسائٹی اور یہ تہذیب اسلام ہے۔ اتحادِ انسانیت اور جمہوری مساوات پر مبنی عالمی نظام اور آفاقی تہذیب کے لیے اقبال کی نظریں اسلام کی آفاقی اقدار کی طرف اُٹھتی ہیں۔ ان کے نزدیک اسلام ہی وہ دین ہے جو تمام جزوی اختلافات سے قطع نظر کر لیتا ہے، جو فطری بشری امتیازات کو قائم رکھتے ہوئے عالم بشریت کو مشترک انسانی قدروں کی بنیاد پر متحد و منظّم رکھتا ہے اور اس تہذیبی تکثیریت کا نتیجہ مغربی ''تکثیریت'' کے تصور کی طرح تہذیبی تصادم اور مغرب کی استعماری آفاقیت کی صورت میں نہیں نکلتا بلکہ اس کی بنیاد پر تو خدا کی اس ارضی بادشاہت میں تمام تہذیبیں اور تمام انسان ایک دوسرے کے تشخص کو تسلیم کرتے ہوئے داخل ہو سکتے ہیں اور مل جل کر امن وسکون اور تہذیبی ہم آہنگی کے ساتھ زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ اس لیے کہ اسلام مغرب کے سامراجی آفاقی تصور کے برعکس تمام تہذیبوں، اقوام اور مذاہب کے تحفظ کا ضامن ہے اور مغرب کی ملوکانہ و منافقانہ پالیسیوں کی بجائے حقیقی عدل اور مساوات پر یقین رکھتا ہے۔ کثیر تہذیبی دنیا میں جس تحمل، رواداری اور عالمگیر بھائی چارے کی ضرورت ہوتی ہے وہ اقبال کے افکار میں بدرجۂ اتم موجود ہے لیکن ہنٹنگٹن اس سے محروم ہے۔ اس مضمون میں ہنٹنگٹن کا سرسری تذکرہ کیا گیا ہے یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہنٹنگٹن کے''

تہذیبی تکثیریت'' اور ''تہذیبی تصادم'' پر ایک نظر ڈال لی جائے تا کہ اقبال سے ایک موازنے کی صورتحال پیدا ہو سکے۔ اور معلوم ہو سکے کہ دونوں تہذیبوں (اسلام اور مغرب) کے یہ نمائندہ مفکرین کس انداز میں ایک دوسرے کو اور دیگر تہذیبوں کو دیکھتے ہیں۔

سرد جنگ کے بعد فوکو یاما نے ۱۹۹۲ء میں ''تاریخ کے خاتمے'' کے روپ میں مغربی تہذیب کی آفاقیت کو پیش کیا تھا جبکہ ۱۹۹۶ء میں ہنٹنگٹن نے تہذیبی تکثیریت اور تہذیبی تصادم کا نظریہ پیش کیا۔ اس کے نزدیک سرد جنگ کے بعد تہذیبی شناخت دنیا میں اتحاد، انتشار اور تصادم کے تانے بانے بن رہی ہے۔ مغرب دوسری تہذیبوں بالخصوص اسلام اور چین سے زیادہ سے زیادہ متصادم ہو رہا ہے۔ اس کے نزدیک اسلام اور کنفیوشین تہذیبیں چونکہ مغرب سے مختلف روایات کی حامل ہیں انسان دوستی، آزاد خیالی، علمی وسائنسی ترقی، جمہوریت پسندی، انسانی حقوق کی بالادستی، کلیسا اور ریاست کی علیحدگی اسلامی اور چینی تہذیبوں میں نہیں پائی جاتیں۔ اس لیے مغربی تہذیب کا تصادم چینی تہذیب اور بالخصوص اسلامی تہذیب سے یقینی ہے۔ اس کے نزدیک چین علیحدگی پسندی، ٹھہراؤ اور سکون کی پالیسی پر گامزن ہے جبکہ اسلام میں احیاء کے شدت پسندانہ جذبات، تشدد، بنیاد پرستی، دہشت گردی اور تنگ نظری کے عناصر کارفرما ہیں۔ اس لیے چینی تہذیب سے بھی زیادہ اسلام مغرب کے لیے خطرہ ہے۔ اگرچہ اس نے انتہائی مدلل انداز میں تاریخی وسیاسی تناظر میں مغرب کے عروج کے ساتھ اس کے زوال پر تبصرہ کیا ہے۔ مشرق کے اثبات اور احیاء پر روشنی ڈالی ہے اور مغرب کی دوغلی، منافقانہ اور سامراجی نوعیت کی پالیسیوں اور تہذیبی تکبر پر تنقید کی ہے۔ مغربی آفاقیت کو ملوکیت کا ایک روپ قرار دیا ہے۔ حتیٰ کہ تہذیبوں کے مشترک خواص کی بناء پر بین التہذیبی ہم آہنگی اور امن وامان کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ اس کے نزدیک امن قائم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ تمام تہذیبیں دوسری تہذیبوں کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے افہام وتفہیم اور تعاون کی راہ اختیار کریں، لیکن اس سے زیادہ وہ تصادم کا نقشہ کھینچتا ہے اور اپنے کثیر تہذیبی نظریے کو تصادم کا نظریہ بنا دیتا ہے اس طرح اس کی تہذیبی تکثیریت تہذیبی ہم آہنگی کی بجائے تہذیبی تصادم کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ مغرب کے زوال اور مشرق کی بیداری سے خوفزدہ ہے اس کے نزدیک مغربی تہذیب اس وقت سب سے طاقتور، مختلف اور منفرد تہذیب ہے لیکن وہ خوفزدہ ہے کہ مغرب اس وقت عروج پر ہونے کے باوجود زوال پذیر ہے اور اب طاقت ایشیا کی طرف منتقل ہو رہی ہے۔ ان حالات میں مغرب کی بقا اس میں ہے کہ اہل مغرب اپنی شناخت کا اعادہ کریں۔ وہ اپنی تہذیب کو

آ فاقی نہیں منفرد سمجھیں ۔ غیر مغربی معاشروں بالخصوص چین اور اسلام کے خلاف متحد ہو جائیں ۔ اپنے معاشی عسکری وسائل کا اظہار، دھمکیوں کا مہارت سے استعمال، چینی غلبے اور اسلامی احیاء کا مقابلہ متحد ہو کر کریں ۔ دوسری قوموں کے درمیان اختلافات کی پالیسی کو اختیار کریں ۔ اس کے تہذیبی تکبر اور تہذیبی تعصب کا اظہار اس کے مختلف بیانات سے ہوتا ہے مثلاً ''اسلام کی خونی سرحدیں''، ''اسلامی احیاء''، ''مغرب کی سب سے منفرد اور طاقتور تہذیب'' وغیرہ ۔ اس نے اسلام کو تشدد اور بنیاد پرستی کا علمبردار قرار دیا ہے ۔ اس کے نزدیک مسلمانوں کا تشدد، دہشت گردی اور زوال دنیا میں بالخصوص مغرب کے ساتھ تصادم کا سب سے بڑا محرک ہے ۔

اگرچہ ہنٹنگٹن نے ''آ فاقی تہذیب'' کی بجائے ''تہذیبی تکثیریت'' کا نظریہ پیش کیا ہے اور امن وامان اور تہذیبی ہم آہنگی کی خواہش کا اظہار بھی کیا ہے لیکن اس کے بے شمار بیانات مغرب کی اسی سامراجی ذہنیت کا اظہار کرتے ہیں جو ''سفید آدمی کا بوجھ'' اور ''آ فاقی تہذیب'' کی اصطلاح سے مترشح ہوتی ہے ۔ کثیر تہذیبی دنیا میں رواداری، اعتدال اور انسانی حقوق کی پاسداری کی ضرورت ہوتی ہے جو کم از کم اسلام کے حوالے سے اس کے ہاں مفقود نظر آتی ہے ۔ اس کے نزدیک مغربی تہذیب ہی اس کثیر تہذیبی دنیا میں ارفع واعلیٰ ہے ۔ اور ایک ترقی یافتہ تہذیب ہونے کی وجہ سے یہ مغرب کی ذمہ داری ہے کہ وہ نہ صرف اسلام کو بلکہ تمام پسماندہ تہذیبوں کو مہذب اور ترقی یافتہ بنائے ۔ اس طرح مقصود ومطلوب کے حوالے سے اس کا تہذیبی تکثیریت کا نظریہ اسی تہذیبی آ فاقیت اور ''تہذیبی مشن'' کے نظریے میں ڈھل جاتا ہے جو مغربی سامراجی استعمار کا مخصوص نظریہ ہے ۔ گویا یہ بھی ایک نیا ڈسکورس ہے جو طاقتور قوم کی طرف سے پسماندہ اقوام کی نفسیات کے عین مطابق استعمال ہوا ہے ۔ ان کی نفسیات وخواہشات کے مطابق ان کے تہذیبی وجود کو تسلیم کر لیا گیا ہے لیکن عالمی سکون، امن وامان اور حقوق کی برابری کے لیے نہیں بلکہ مغرب کو متحد کرنے، مستحکم کرنے اور کمزور تہذیبوں پر مغرب کی تہذیبی برتری کو قائم رکھنے کے لیے ۔ اس کتاب کو مستقبل کی پالیسی کے لیے مفید قرار دیا گیا ہے چنانچہ سرد جنگ کے خاتمے اور ۱۱/ ۹ کے بعد سے مغرب بالخصوص امریکہ کی جو پالیسی مسلمانوں کے بارے میں ہے وہ اظہر من الشمس ہے ۔ (۳۰)

گزشتہ صفحات میں اسلام کے حوالے سے اقبال کے افکار کا جائزہ لیا جا چکا ہے ان کا کثیر تہذیبی نظریہ یا آ فاقی نقطۂ نظر دنیا پر سامراجی قبضے کے لیے نہیں ہے بلکہ انسانی اتحاد کے لیے ہے ۔ ان کا تہذیبی مشن سامراجی

اور استعماری مقاصد کے لیے نہیں بلکہ دنیا کی تمام تہذیبوں کو مہذب اور ترقی یافتہ بنانے کے لیے ہے۔ان کے افکار میں ہنٹنگٹن ،فوکویاما (یا مغرب) کے سامراجی عالمی نظام کے مقابلے میں ایک انسانیت نواز نئے عالمی نظام کے اشارے پوشیدہ ہیں۔

''دراصل انسانیت کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے اور جب تک تمام دنیا کی علمی قوتیں اپنی توجہ کو احترامِ انسانیت کے درس پر مرکوز نہ کردیں یہ دنیا بدستور درندوں کی بستی بنی رہے گی......وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے جو رنگ ونسل وزبان سے بالاتر ہے۔جب تک اس نام نہاد جمہوریت ،اس ناپاک قوم پرستی ،اس ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو مٹایا نہ جائے گا۔جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے ''الخلق عیال اللہ'' کے اصول کا قائل نہ ہو جائے گا ،جب تک جغرافیائی وطن پرستی اور رنگ ونسل کے اعتبارات کو مٹایا نہ جائے گا اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح وسعادت کی زندگی بسر نہ کر سکے گا۔اور اخوت ،حریت اور مساوات کے شاندار الفاظ شرمندۂ معنی نہ ہوں گے۔'' (۳۱)

آدمیت احترامِ آدمی — باخبر شو از مقامِ آدمی
برتر از گردوں مقامِ آدم است — اصل تہذیب احترامِ آدم است

(کلیاتِ اقبال فارسی ،ص ۷۵۶،۷۹۳)

یہ احترامِ آدمیت اور انسانوں کا اتحاد وہ ہے جس کو مغرب کی سامراجی سیاست اور نوآبادیاتی آفاقیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔اس میں تمام انسان ،تمام مخلوقات ،عیالُ اللہ ہیں۔اسی لیے یہ انسانی اتحاد وآفاقیت ،تہذیبی تصادم ،انسانی وحدتوں کی تخریب وتباہی اور اسلامی ومغربی تہذیبی بحران پر دلالت نہیں کرتی بلکہ صحیح معنوں میں انسانیت اور احترامِ آدمیت کی بنیادوں پر ایک مشترکہ بین الاقوامی برادری تشکیل کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے کثیر تہذیبی نظریے میں سامراجیت اور تصادم کی ہلکی سی جھلک بھی نظر نہیں آتی۔وہ تو تہذیبوں کے مابین مکالمے اور توازن کی فضا قائم کرنا چاہتے ہیں۔ان کے افکار میں خفیف ترین سطح پر بھی کوئی ایسا اشارہ نہیں ملتا جسے تہذیبوں کے درمیان تصادم یا اسلامی اور مغربی تہذیبوں کے مابین تصادم کا نام دیا جا سکے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں اسلامی اور مغربی تہذیبوں کے تقابلی مطالعے کا ہر زاویہ بین التہذیبی ہم

آہنگی، اتحاد واشتراک، ایک دوسرے سے استفادے اور مکالمے کی طرف رخ کرتا ہے۔ وہ ایک ایسی عالمی تہذیب کی بات کرتے ہیں جس میں تہذیبوں کی جنگ کی بجائے تہذیبوں کے اشتراک واتحاد کا روشن اور وسیع المشرب تصور اُبھرتا ہے اور اسی تصور کے پس منظر میں اقبال کے افکار کو اور اقبال کے افکار کے حوالے سے اسلام کے افکار سمجھا جاسکتا ہے۔ پائپس اور ہنٹنگٹن نے اسلام کے حوالے سے جس تعصب کا اظہار کیا ہے اس کا ذکر کیا جاچکا ہے لیکن اقبال کے ہاں مغربی تہذیب کے بارے میں اس قسم کے تعصب اور تنگ نظری کا شائبہ بھی نہیں ہے بلکہ انہوں نے تو مغربی تہذیب کے زندہ اجزاء کا بڑی کشادہ دلی سے اعتراف کر کے اس سے استفادے کا درس دیا ہے۔ انہوں نے مثبت عناصر کی وجہ سے مغربی تہذیب کو اسلامی تہذیب کی توسیع قرار دیا ہے جو کثیر تہذیبی دنیا میں تصادم کی بجائے اتحاد اور مکالمے کی راہ ہموار کرتا ہے۔ یقیناً یہ اسلامی افکار کی روشنی میں تہذیبوں کی نفسیات کے گہرے مطالعے پر دلالت کرتا ہے چنانچہ اقبال کے خطبۂ اوّل کا یہ اقتباس ''تہذیبی تکثیریت'' اور ''تہذیبی آفاقیت'' کے اس دور میں بنیادی کلید کی حیثیت رکھتا ہے۔

> ''پچھلے پانچ سو برس سے الٰہیاتِ اسلامیہ پر جمود کی کیفیت طاری ہے وہ دن گئے جب یورپ کے افکار دنیائے اسلام سے متاثر ہوا کرتے تھے۔ تاریخ حاضرہ کا سب سے زیادہ توجہ طلب مظہر یہ ہے کہ ذہنی اعتبار سے عالمِ اسلام نہایت تیزی کے ساتھ مغرب کی طرف بڑھ رہا ہے اس تحریک میں بجائے خود کوئی خرابی نہیں ہے کیونکہ جہاں تک علم وحکمت کا تعلق ہے، مغربی تہذیب دراصل اسلامی تہذیب ہی کے بعض پہلوؤں کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے لیکن اندیشہ یہ ہے کہ اس تہذیب کی ظاہری آب وتاب کہیں اس تحریک میں حارج نہ ہوجائے اور ہم اس کے حقیقی جوہر، ضمیر اور باطن تک پہنچنے سے قاصر رہیں۔'' (۳۲)

چنانچہ اقبال کے نزدیک مغربی تہذیب ڈرنے کی چیز نہیں ہے۔ مسلمان اس سے استفادہ کر سکتے ہیں (۳۳) اس لیے کہ یہ تہذیبی سرچشمہ تو وہی ہے جو خود اسلام کے تخلیقی سوتوں سے پھوٹا تھا۔ البتہ احتیاط طلب امر یہ ہے کہ مسلمان مغرب کی حقیقی اندرونی روح کو یعنی مغرب کی صحت مند اقدار، سائنسی علوم اور ٹیکنالوجی کو حاصل کریں نہ کہ ظاہری چمک دمک کو۔ اس اعتبار سے مغربی تہذیب اسلام کے لیے کوئی خطرہ نہیں بلکہ مسلمانوں کے لیے تعمیر وترقی کا وسیلہ ہے (ظاہر ہے یہ نظریہ ہنٹنگٹن کے اس متعصّبانہ اور تخریبی نظریے کے

بالکل برعکس ہے جس کے تحت اسلام میں تشدد اور جہالت کے سوا کچھ نہیں اور جس کے تحت اسلام مغرب کے لیے خطرہ ہے)۔اس کے لیے اقبال کے نزدیک پورے طور پر ناقدانہ بصیرت اور آزادانہ تحقیق کی ضرورت ہے تاکہ دونوں تہذیبوں کے خدوخال سامنے آسکیں اور اس سے اپنے اصولوں کی روشنی میں استفادہ کرنے میں آسانی ہو۔ پھر چونکہ خود اسلام پانچ سو سال سے جمود کا شکار ہے اس لیے اسلام کے اصولوں کی درست تشریح بھی ضروری ہے تاکہ اسلام بحیثیت ایک ایسے پیام کے، جس کا خطاب ساری نوعِ انسانی سے ہے، اُجاگر ہو سکے۔(۳۴)

کثیر تہذیبی دنیا میں، تصادم کے اس ماحول میں اسلام کو مغرب سے استفادے کا مشورہ دینا بے حد جرأت مندانہ اور اہمیت کا حامل مرحلہ ہے۔اس لیے کہ اس سے دونوں تہذیبوں کے درمیان مشترک رشتوں کی وضاحت ہوتی ہے۔ (جو تصادم کے ماحول میں یقیناً ایک جرأت مندانہ اور کشادہ روی کا عمل ہے)۔ دوسرے لفظوں میں اقبال اسلام اور مغرب کے مابین ایک رشتۂ مطابقت، ایک پل استوار کرنا چاہتے ہیں، ایک ایسا اشتراکِ عمل جس میں دونوں تہذیبوں کی فطری اور امتیازی خصوصیات بھی برقرار رہیں اور دونوں ایک دوسرے کے قریب بھی آجائیں اور اس طرح دونوں کے مابین ایک اصولی اور پرامن مکالمے کی راہیں ہموار ہو جائیں۔

اقبال نے جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہٗ، سرسیّد، شبلی، سیّد امیر علی، نامق کمال، مفتی عالم جان جیسے روشن خیال مفکرین کی طرح بڑی جرأت کے ساتھ تازہ مغربی افکار کو اسلام کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ایسے مسلمان ہیں جو مغربی خیالات کو اسلام کے افکار کی روشنی میں جانچ پرکھ کر اختیار کرتے ہیں اور اس طرح اپنی تہذیب میں جذب کر کے تہذیبی ہم آہنگی، پرامن بقائے باہمی اور مکالمے کا ثبوت دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کا کہنا تھا کہ ''اسلام جدید سائنس اور مغربی فکر کے بہترین اجزاء سے مطابقت رکھتا ہے'' ان مصلحین نے ''جدید سائنسی، ٹیکنیکی یا سیاسی خیالات (آئینی اور نمائندہ حکومت اور اداروں) کو قبول کرنے کے لیے اسلامی جواز'' فراہم کیا۔ انہوں نے مغربی استعمار سے مقابلے کے لیے ان کی اصل طاقت یعنی سائنس، ٹیکنالوجی اور تنظیم کو اپنانے پر زور دیا۔(۳۵)

اقبال ان مفکرین ہی کی مانند جدیدیت اور مغربیت کی بحث میں جدیدیت کے قائل ہیں اور اسی لیے ''نظریۂ عاریت'' (Borrowing Theory) کے تحت ''ثقافتی مستعاریت'' کو مدنظر رکھتے ہیں۔ وہ

تہذیبی کشمکش میں مغربی ماڈل کوبجنسہ اختیار کرنے کے خلاف ہیں لیکن مغرب کے صحت منداجزاء کو جذب کرنے کے حامی ہیں۔''ثقافتی مستعاریت'' اور''جدیدیت'' کے اسی تصور کے تحت ایسی کثیر تہذیبی دنیا وجود میں آتی ہے جہاں تصادم کی بجائے بات چیت اور مذاکرات کے ذریعے اختلافی امور کو بھی حل کیا جا سکتا ہے۔ امن وانصاف کا حصول بھی ممکن بنایا جا سکتا ہے اور ایک دوسرے سے پرامن لین دین اور استفادے کا عمل بھی تیز تر کیا جا سکتا ہے۔

تہذیبی تکثیریت کا یہ وہ تصور ہے جس میں اپنی تہذیبی خودی بھی برقرار رکھی جاتی ہے اور دوسری تہذیب کی خودی کی پاسداری بھی کی جاتی ہے۔ دوسری تہذیب کے بعض اجزاء کو قبول بھی کیا جاتا ہے اور بعض اجزاء کو رد بھی کیا جاتا ہے لیکن اس رد میں اختلاف اصولی ہوتا ہے نہ کہ ذاتی ومتعصّبانہ۔ اس لیے کسی تہذیب کے استحصال کی نوبت نہیں آئی بلکہ دوسری تہذیبوں کے ساتھ مسلسل ایک ڈائیلاگ کی کیفیت برقرار رہتی ہے اس طرح تہذیبی تکثیریت کا یہ نظریہ آفاقی تہذیب کے ایسے نظریے میں ڈھل جاتا ہے جس میں دیگر تہذیبیں بھی اپنا وجود رکھتی ہیں اور اپنا وجود رکھتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ انسانی بنیادوں پر متحد ومنظّم ہو جاتی ہیں۔

اقبال نے مغربی اور اسلامی تہذیبوں کا تجزیہ سیاسی یا ہنگامی بنیادوں پر یا کسی سامراجی اقتدار کی سیاست سے وابستہ ہو کر نہیں کیا بلکہ غیر جانبدارانہ انداز میں اصولی وفکری بنیادوں پر کیا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ مسلم مفکر ہونے کے ناطے مغرب کی ہر قدر کو حقارت یا نفرت کی نظر سے دیکھا ہو۔ بلکہ انہوں نے موجودہ اسلامی تہذیب اور مغرب کی جدید تہذیب دونوں کے معائب اور محاسن کو واضح کیا ہے چنانچہ ان کے ہاں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں:

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے مے خانے
یہاں ساقی نہیں پیدا وہاں بے ذوق ہے صہبا

(کلیاتِ اقبال اُردو، ص ۳۶۰)

اقبال نے دراصل دونوں کی خوبیوں خامیوں کو سامنے رکھ کر ایک دوسرے کو آئینہ دکھایا ہے۔ ان کا مطمحِ نظر یہ ہے کہ اہل مغرب اور اہل اسلام دونوں ایک دوسرے کی خوبیوں اور خامیوں پر نظر رکھ کر، ایک دوسرے سے بات چیت کے ذریعے، ایک دوسرے سے مکالمے کے ذریعے استفادہ کریں تا کہ انسانی تہذیب کے یہ دونوں حصے زندگی کی فلاح و بہبود کے لیے ایک ہی وحدت کے طور پر کام کر سکیں۔

مشرق سے نہ ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر فطرت کا تقاضا ہے کہ ہر شب کو سحر کر

(کلیاتِ اقبال اُردو، ص۶۲۱)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اقبال تہذیبی تکثیریت کے قائل ہیں۔ اس تہذیبی تکثیریت میں مختلف تہذیبیں تصادم اور مناقشت کا شکار نہیں ہوتیں بلکہ ایک دوسرے سے استفادے کے ذریعے ایک ایسی آفاقی تہذیب کو جنم دیتی ہیں جس کی بنیاد اخوت اور مساوات پر ہے۔ اقبال کو معلوم ہے کہ تہذیبی اکثریت قوموں کی فطری اور نفسیاتی ضرورت بھی ہے اور کائناتی ارتقا کا وسیلہ بھی۔ لیکن ایسی تہذیبی تکثیریت ہی انسانی وحدت کو جنم دے سکتی ہے جس میں نفرت اور رقابت کی بجائے اشتراکِ عمل اور مکالمے کا پہلو پایا جائے۔ چنانچہ اقبال نے اسلام کے آفاقی اصولوں اخوت، مساوات اور حفظِ نوعِ انسانی کے حوالے سے کوشش کی ہے کہ ایک طرف تو تہذیبیں اپنی اپنی انفرادیت (یا خودی) برقرار رکھیں دوسری طرف ہر قسم کی غلط فہمیوں اور تنگ نظری وتعصب سے نکل کر امن ومحبت، باہمی رواداری، انسانی حقوق کی بالادستی، بین المذاہب ہم آہنگی، تہذیبی سنگم اور بقائے باہمی کی طرف لوٹ آئیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آج تہذیبی کشمکش کے اس دور میں اسی قسم کی ''ثقافتی مستعاریت''، ''تہذیبی تکثیریت'' اور ''تہذیبی آفاقیت'' کی ضرورت ہے۔ آج ایک دوسرے سے استفادے اور افہام وتفہیم کا یہی لچک دار روّیہ اتحادِ انسانیت کی فضا پیدا کرسکتا ہے اور ایسے مشترکہ اور منصفانہ عالمی نظام اور عالمی تہذیب کی فضا پیدا کرسکتا ہے جس کی بنیاد اخوت، مساوات اور وحدتِ انسانی پر ہو۔ آج تہذیبوں کے مستقبل کا انحصار اسی افہام وتفہیم پر ہے کہ نہ صرف اسلامی اور مغربی تہذیبیں بلکہ تمام تہذیبیں ایک دوسرے کو کچھ سکھاتے ہوئے آگے بڑھیں۔ ایک دوسرے کی تاریخ سے فن اور ثقافت، تصورات اور اقدار کا مطالعہ کرتے ہوئے، ایک دوسرے کی زندگیوں کو زرخیز بناتے ہوئے ایک پُرامن عالمِ نو کی تخلیق کریں جس میں اقوام اپنے مسائل گفت وشنید کے ذریعے حل کرسکیں۔ جس میں تہذیبوں کے فطری امتیازات بھی برقرار رہیں (جو کہ ان کا حق ہے) اور ان میں مفاہمت واتحاد بھی پیدا ہوجائے۔ اقبال کا یہی وہ عالمی نظام ہے جس میں اس کرۂ ارض کے تمام باشندے اور تمام تہذیبیں ایک وحدت میں ڈھل کر اجتماعی فلاح وبہبود کے لیے کوشش کرسکتے ہیں اور ایک ایسا عالمِ نو وجود میں لاسکتے ہیں جہاں کسی بھی فساد، کسی بھی اختلاف کا حل مل جل کر نکالا جاسکے۔ اس سلسلے میں اقبال کے نزدیک اسلام ایک زندہ قوت کے طور پر اہم ترین کردار ادا کرسکتا ہے۔ اس لیے کہ اسلام میں تمام انسان

برابر ہیں۔حریت، مساوات اور انسانی اتحاد اس کی بنیادی اقدار ہیں اور اس لیے کہ اسلام ہی وہ دین ہے جو ''باوجود تمام فطری امتیازات کے عالمِ بشریت کو متحد و منظّم کرتا ہے''۔

حواشی

1. Spengler,"Decline of the West",(Vol.II),A.A.Knopf,New York,1928,PP.170
2. Ibid., PP.31
3. Toynbee,"The study of history",Oxford University Press,London,Vol.I,1934,/Vol.10,1954,PP.133/ 546,547
4. Huntington,"The Clash of Civilizations and remaking of world order",Simon and Schuster,New York, 1997,PP.44 to 48
5. Lester Pearson,"Democracy in world politics",Princton University Press,Princton,1955,PP.83,84

۶۔ سرور، آلِ احمد، پروفیسر، دانشورِ اقبال، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۵۴، ۵۵

7. Huntington,"The Clash of Civilizations",See Part iv
8. Fukuyama,"The end of history?",The national Interest 16(,Bi-montholy Journal),Washington D.C.,Summer 1989,PP.4,18;
   Fukuyama,"The end of history and the last man",Free Press New York,1992,PP.215,288

۹۔ مثلاً ملاحظہ کیجیے:

Huntington,"Clash of Civilizations",Chapter No.3;
Broudal,"On history,University of Schicago Press, Schicago,1980,PP.xxxiii;
Spengler,"Decline of the west (Vol.I),A.A.Knopf,New York,1962,PP.93,94

۱۰۔ ابن انشاء، ابن بطوطہ کے تعاقب میں، لاہور اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۷۹

11. Huntington,"Clash of Civilization",PP.74

۱۲۔ سرور، آلِ احمد، پروفیسر، دانشورِ اقبال، ص ۵۱،۵۲

۱۳۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، مضمون ''اقبال اور تہذیبوں کے مابین مکالمے کی اہمیت''، مشمولہ ''اقبال مشرق و مغرب کی نظر میں''، مرتبہ، سوندھی ٹرانسلیشن سوسائٹی، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۱۰۹

14. Spengler,"Decline of the west",(Vol.II),A.A.Knopf,New York,1928,P.50;
Bozeman,"Civilzation under stress",Verginia Quarterly Review 51,(winter 1975),PP.5;
Huntington,"Clash of Civilizations",P.76

۱۵۔ کپلنگ کی نظم ''White Man's Burden'' کے لیے دیکھیے:
Kipling, Rudyard,"The works of Rudyard Kipling",words worth poetry library,Heartfordshire, 1994, (Reprinted),PP.323

۱۶۔ ملاحظہ کیجیے مندرجہ بالا حاشیہ نمبر ۸:

17. Huntington,"Clash of Civilization's",P.66,310

۱۸۔ اقبال، حرفِ اقبال، مرتبہ، لطیف احمد شروانی، ایم ثناءاللہ خان، انشاء پریس لاہور، ۱۹۵۵ء، ص ۲۳،۲۴

۱۹۔ پیش لفظ از سارتر، مشمولہ، افتادگانِ خاک، از فینن، فرانز، ترجمہ، سجاد باقر رضوی/محمد پرویز، نگارشات، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۲۵،۲۶

20. Pipes,"In the path of God",Basic Books,New York,1983,PP.197,198

۲۱۔ علی شریعتی، ''علامہ اقبال...... مصلح قرنِ آخر''، ترجمہ، کبیر احمد جائسی، فرنٹیئر پوسٹ پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۶۶

۲۲۔ فینن، فرانز، افتادگانِ خاک، ترجمہ، سجاد باقر رضوی/محمد پرویز، ص ۲۸۷

۲۳۔ اقبال، مقالاتِ اقبال (جغرافیائی حدود اور مسلمان)، مرتبہ، عبدالواحد معینی، سیّد، آئینۂ ادب، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۲۶۶

۲۴۔ ایضاً، ص ۲۷۶

۲۵۔ محمد شہاب الدین ندوی، مولانا، ''عصر حاضر اور اسلام کی عالمگیر تعلیمات''، مشمولہ، مجلّہ سہ ماہی اقبال، بزمِ اقبال، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۳۷

۲۶۔ اقبال، اقبال نامہ، مرتبہ، شیخ عطاء اللہ (طبع نو، تصحیح وترمیم شدہ ایڈیشن، یک جلدی اشاعت)، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۳۴۶، ۳۴۷

۲۷۔ ایضاً، ص ۳۴۹، ۳۵۰

۲۸۔ اقبال، مقالاتِ اقبال (جغرافیائی حدود اور مسلمان) ص ۲۶۶

۲۹۔ اقبال، اقبال نامہ، مرتبہ، شیخ عطاء اللہ (طبع نو، تصحیح وترمیم شدہ ایڈیشن، یک جلدی اشاعت) ص ۳۴۸، ۳۵۷

۳۰۔ ان بیانات کی تصدیق اور ہنٹنگٹن کے خیالات کی تفصیل کے لیے دیکھیے:

Clash of Civilizations, by

Huntington,PP.19-21,28-29,102-104,183,209-218,254-258,308-312,318-321

۳۱۔ اقبال، حرفِ اقبال، ص ۲۲۴، ۲۲۵

۳۲۔ اقبال، تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، ترجمہ، نذیر نیازی، سیّد، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۱۱

۳۳۔ نذیر نیازی، سیّد، اقبال کے حضور، اقبال اکادمی، کراچی، ۱۹۷۱ء، ص ۲۸۵

۳۴۔ اقبال، تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، ترجمہ، نذیر نیازی، سیّد، ص ۱۳

۳۵۔ اقبال، حرفِ اقبال، مرتبہ، لطیف احمد شروانی، ص ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۱؛

جاوید اقبال، ڈاکٹر، مضمون ''اقبال اور تہذیبوں کے مابین مکالمے کی اہمیت''، مشمولہ ''اقبال مشرق ومغرب کی نظر میں''، ص ۱۰۹؛

Esposito,"Islamic Threat:Myth or Reality",Oxford University Press, New York,1992,Pp.55;
Pipes,"In the path of God",PP.114-120;
Stoddered,"The new world of Islam",Oxford University Press,New York,1922,PP.54